اثباتِ عقائد کا اصولی طریقہ کار

اور متعلقہ کوتاہیاں

تحریر

مفتی عبید الرحمان صاحب

رئیس دارالافتاء والارشاد، مردان

مکتبہ دارالتقویٰ مردان

عقیدے کی اصولی حیثیت

عقیدہ ،دیگر شرعی احکام کی طرح ایک شرعی حکم ہے، اس کا تعلق اگر چہ ظاہری اعضاء وجوارح کے ساتھ نہیں ہوتا، بلکہ دل ودماغ کے ساتھ اس کا تعلق ہے، جس طرح نماز، روزہ، جہاد وغیرہ احکام پر عمل کرنا اور ان کی ادائیگی کرنا ضروری ہے، یوں ہی نصوص میں وارد ہونے والے عقیدے کی باتوں کی حقانیت اور سچائی کا خیال واعتقاد رکھنا بھی ضروری ہے، لہٰذا:

الف: جس طرح دیگر تمام شرعی احکام شرعی دلائل ہی سے ثابت ہوسکتے ہیں ،یوں ہی عقیدہ کی باتیں بھی شرعی دلائل ہی کے ساتھ مربوط اور اسی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔

ب: جس طرح دیگر شرعی مسائل واحکام میں شرعی دلیل کا سہارا لئے بغیر اپنی طرف سے قطع وبرید کرنا کسی طرح جائز نہیں ہے بلکہ مذموم وابتداع ہے، یوں ہی عقیدے کے باب میں بھی ایسی جرأت کرنا ابتداع کہلاتا ہے جو عملی ابتداع سے زیادہ مذموم اور خطرناک ہے۔

ج: جس طرح دیگر شرعی احکام میں شرعی دلیل کا سہارا لئے بغیر اپنی طرف سے کیفیات وہیئات مقرر کرنا اوراس کو دین وشریعت کا درجہ دینا مذموم اور ممنوع ہے، یوں ہی عقیدے کے میدان میں بھی کسی ثابت شدہ عقیدہ میں اپنی طرف سے کسی کیفیت وتفصیل کا اضافہ کرنا اور اس کو شرعی عقیدے کا درجہ دینا مذموم اور ابتداع ہے۔

عقائد کے اصول و مصادر

شرعی احکام کے اصول و مصادر کل چار ہیں:

۱: قرآن کریم۔ ۲: سنت رسول ﷺ۔ ۳: اجماع امت۔ ۴: قیاس۔

ان چاروں میں سے کسی ایک مصدر سے شرعی حکم ثابت ہو سکتا ہے، اگر کوئی شخص کسی بات کو شرعی حکم بتلاتا ہے تو ضروری ہے کہ ان چاروں میں سے کسی ایک جگہ سے وہ ثابت ہو، ورنہ اس کو شریعت کا حکم کہنا درست نہیں ہو گا، اسی طرح اگر کوئی شخص کسی قضیہ کا شرعی حکم معلوم کرنا چاہے تو اس کے لئے بنیادی طور پر ان چاروں میں سے کسی ایک مصدر کی طرف رجوع کرنا ضروری ہو گا۔ یاد رہے کہ یہ چار چیزیں صرف اصطلاحی فقہ ہی کے اصول نہیں ہیں، بلکہ پورے دین و شریعت کے اصول و مصادر ہیں، جس کے تحت اصطلاحی علم فقہ، علم کلام، علم تصوف، سب داخل ہیں، لہٰذا ان علوم وابواب میں کسی بھی باب کو شرعی حکم و تعلیم کا درجہ دینا ہو، تو اس کے لئے بنیادی طور پر ان چار مصادر کا سہارا لینا ضروری ہے اور اگر کوئی چیز ایسی ہے جو ان میں سے کسی بھی مصدر سے ثابت نہ ہو، اس کو شریعت کا درجہ دینا زیادتی اور جسارت کی بات ہے۔

تاہم عقائد کے باب میں قیاس سے کام نہیں لیا جاتا، قیاس سے عقائد ثابت نہیں ہوتے، یہاں پہلے تینوں مصادر ہی سے کام لیا جاسکتا ہے۔ "عقل سلیم" سے بھی ایک خاص دائرہ کار میں استفادہ کیا جاسکتا ہے چنانچہ وجود خداوندی اور توحید خداوندی کے باب میں عقل سے استفادہ کرنے اور شریعت کا حکم وارد ہوئے بغیر بھی اس کا اعتقاد رکھنے کو ضروری قرار دیا جاتا ہے اور حضرت امام صاحب رحمہ اللہ

سے منقول ایک روایت کے مطابق اس کے خلاف کرنے پر انسان جہنم کا سزاوار بھی قرار پاتا ہے، لیکن محققین کے نزدیک راجح یہی ہے کہ اس کو شریعت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا اور شرعی حکم کے وارد نہ ہونے کی تقدیر پر محض عقلی استدلال نہ کرنے کی بنیاد پر جہنم کا سزاوار نہیں ہوتا۔

اجماع امت بلا شبہ ایک "اصل شرعی" اور "مصدر احکام" ہے، لیکن غور کیا جائے تو اس کا رجع بھی آخر کار قرآن وسنت ہی کی طرف ہوتا ہے خاص کر عقیدے کے باب میں، کیونکہ عقیدے کا حاصل اور بنیاد غیب کی خبر ہے جس تک وحی کے بغیر رسائی متیقن نہیں ہے۔

"طریقہ محمدیہ" میں ایک سوال اور اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

فإن قيل ما قد سبق دل على أن الكتاب والسنة كافيان في أمر الدين، وأن ما لم يثبت بأحدهما بدعة وضلالة فكيف يستقيم قول الفقهاء: الأدلة الشرعية أربعة؟

قلنا لا بد للإجماع من سند من أحدهما حالا أو مآلا على الصحيح و للقياس من أصل ثابت بأحدهما فإنه مظهر لا مثبت فمرجع الأحكام ومثبتها اثنان في الحقيقة.[1]

ترجمہ: "اعتراض: پہلے گزر چکا ہے کہ کتاب وسنت ہی دینی مسائل کے اثبات کے لیے کافی ہیں، اور جو چیز ان میں اگر کسی ایک سے بھی ثابت نہ ہو وہ بدعت اور گمراہی ہے، تو پھر فقہاء کے اس بات کا کیا معنی ہے کہ شرعی دلائل کل چار ہیں؟ جواب (فقہاء

---

[1] الطريقة المحمدية، ص٥٥.

کرام کی بات درست ہے اور دلائل کل چار ہیں، تاہم تیسری دلیل جو ہے یعنی) اجماع (اس) کے لیے کتاب وسنت کا کوئی مرجع ضروری ہے، نیز قیاس کے لیے بھی کوئی قرآن وسنت کی کوئی بنیاد ضروری ہے، کیونکہ قیاس احکام کے اظہار کا ذریعہ ہے از سر نو اثبات کا نہیں، کیونکہ دینی مسائل کا مستقلا اثبات صرف قرآن وسنت سے ہی ہو سکتا ہے۔

اعتقاد کے باب میں کچھ رائج غلط فہمیاں اور غلط کاریاں

غلط فہمی کا تعلق سمجھ بوجھ کے ساتھ ہوتا ہے جبکہ غلط کاری عملی تعامل اور اقدام کے ساتھ مربوط ہوتا ہے، اس وقت ان دونوں مرحلوں پر متعدد غلطیاں برتی جاتی ہیں، یوں تو ایسی غلطیاں بہت ہیں اور اس پر مستقل مقالہ لکھنے کی گنجائش بلکہ شاید ضرورت ہے، کوئی دردمند عالم دین یہ کام کرے تو امت کے لئے بہت کچھ رہنمائی کا سامان ہاتھ آجائے گا۔ تاہم یہاں "صلاح اور اصلاح احوال کے جذبے سے "چند عمومی غلطیاں ذکر کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

پہلی غلطی: غیر مصادر سے عقیدہ لینا

سابقہ سطور میں ذکر کیا گیا ہے کہ شرعی عقائد کے بنیادی مصادر قرآن وسنت (یا زیادہ سے زیادہ اجماع امت) ہی ہیں، انہی میں سے کسی سرچشمہ سے شرعی عقیدہ اخذ کیا جاسکتا ہے، ان دلائل کا سہارا لئے اپنی طرف سے کسی چیز کو شرعی عقیدہ کا درجہ دینا یا غیر شرعی مصدر سے کام لے کر کسی بات کو شرعی اعتقاد کا مقام دینا ابتداع، مذموم اور ممنوع ہے، لیکن ہمارے ہاں اس سلسلے میں کشوف والہامات، ذوق، خواب اور پیش گوئی جیسی چیزوں کی بنیاد پر بھی مختلف امور کو عقائد

کا درجہ دیاجاتاہے، چنانچہ کبھی تو ان چیزوں کی بنیاد پر کوئی مستقل عقیدہ بنایاجاتاہے اور کبھی مستقل عقیدہ تو اختیار نہیں کیاجاتا لیکن کسی ثابت شدہ عقیدے میں ان چیزوں کی بنیاد پر کسی شق کی کمی یازیادتی کی جاتی ہے۔

پہلی مثال: یزید کی حیثیت

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ہمارے ہاں "یزید" کی حیثیت اور اس کے مقام ومرتبہ کاقضیہ ایک عرصہ تک گرم رہاہے، بعض لوگوں نے اس کو "امیر المؤمنین سیدنا یزید" قرار دیا ہے،اس کے بالمقابل بعض لوگوں نے اسے کافر وزندیق تک قرار دیا، جبکہ اہل علم کی ایک کثیر تعداد کے نزدیک وہ ایک فاسق مسلمان تھا۔ان میں سے کونسا قول راجح ہے؟اور یزید کی واقعی حیثیت کیا تھی؟اس بات سے صرف نظر کرتے ہوئے مقصد کی بات یہ ہے کہ یہ ایک تاریخی قضیہ ہے،چنانچہ قرآن وسنت میں "یزید" کا نام مذکور نہیں ہے، چہ جائیکہ اس کی تکفیر/تفسیق یاتعدیل کا ذکر ہو،لہٰذا ان میں سے کسی بھی قول کو عقیدہ کا درجہ دینا اور اس کی بنیاد پر کسی کے ہدایت یافتہ ہونے یا گمراہ ہونے کے فیصلہ کرنا بالکل درست نہیں ہے،بلکہ جسارت وزیادتی کی بات ہے۔

اس قضیہ میں زیادہ سے زیادہ جو بات قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ یزید کی حیثیت متعین کرنے کے ضمن میں حضرات صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے مقام ومرتبہ پر کوئی آنچ نہ آنے پائے، ایک طرف سیّدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ہے اور دوسری طرف سیّدنا حسین رضی اللہ عنہ ہے، دونوں صحابہ کرام ہیں اور دونوں کی تعظیم وتعدیل واجب ہے، اس بات کی رعایت رکھنے کے بعد اگر کوئی

شخص سمجھتا ہے کہ یزید نے خلاف شریعت کوئی کام نہیں کیا، اوراس کے خلاف تاریخی روایات واہیات ہیں تو بھی درست ہے، اور اگر کسی شخص کی تحقیق یہ ہے کہ یزید نے یقینی طور پر ظلم وزیادتی کا بازار گرم کر رکھا تھا اور کھلم کھلا عام متعدد گناہوں کا ارتکاب کرتا پھرتا تھا، اس لئے وہ فاسق ہے تو بھی درست ہے، دونوں صورتوں میں کسی "اصل شرعی" کی مخالفت لازم نہیں آتی، بلکہ زیادہ سے زیادہ تاریخی روایات کی تصدیق یا تکذیب ہو جاتی ہے جس کا اسلام وکفر یا سنت وبدعت کے ساتھ براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ ہمارے ہاں اس کو عقیدہ کا درجہ دیا جاتا ہے اور اس کی بنیاد پر بھی ہدایت وگمراہی کے فیصلے کئے جاتے ہیں۔

دوسری مثال: تصوف وتاریخ کی کتابوں سے عقیدہ لینا

اس کی دوسری مثال تصوف وتاریخ کی کتابوں پر عقیدے کی بنیاد استوار کرنا ہے، تاریخ کا ذخیرہ رطب ویابس باتوں پر مشتمل ہوتا ہے، احادیث مبارکہ کے ذخیرے کو جس طرح "اصول حدیث" کے معیار پر پرکھ کر بڑے احتیاط کے ساتھ مرتب فرمایا گیا ہے، تاریخ کا ذخیرہ اس طرح جانچ وپڑتال سے محفوظ نہیں ہو سکا، اس لئے اس میں جس طرح بہت سی باتیں درست اور واقع کے مطابق ہو سکتی ہیں ،یوں ہی اس میں بے سروپا باتوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے، اسی طرح تصوّف باوجود یہ کہ شریعت کا حصہ اور شرعی تعلیمات پر دل وجان سے عمل کرنے کا کامیاب ذریعہ ہے، لیکن اس نام پر کتابوں کا جو ذخیرہ موجود ہے، اس میں بہت سی ایسی باتیں شامل ہیں جو شرعی دلائل کے مطابق نہیں ہیں، یا کم از کم شرعی دلائل کا

مفہوم ومصداق نہیں ہیں، ایسی باتوں کو شرعی عقیدہ کا درجہ دینا نہ صرف بے جا اور غلط ہے بلکہ ابتداع اور حد درجہ مذموم ہے۔

دوسری غلطی: فرقِ مراتب نہ کرنا

متکلمین کی اصطلاح میں "عقیدہ" اصلاً وہ ہے جس کا تعلق اعضاء وجوارح کے ساتھ نہ ہو بلکہ عقل کے ساتھ ہو، اس کی تصدیق کرنا، اس کو درست تسلیم کرنا ضروری ہو اور اس پر کوئی قطعی دلیل قائم ہو۔ لیکن بعد میں اس لفظ میں وسعت کا پہلو اختیار کیا جاتا رہا، چنانچہ جس چیز کا شرعاً اعتقاد و تصدیق ضروری ہو، وہ عقیدہ کہلایا جانے لگا، چاہے اس پر کوئی قطعی دلیل موجود ہو یا نہ ہو۔

پہلی اصطلاح کے مطابق عقائد ہمیشہ قطعی ہی ہوتے ہیں، جب کہ دوسرے استعمال کے مطابق اس کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم قطعی عقائد کی ہے، جب کہ دوسری قسم میں ظنی نوعیت کے عقائد داخل ہو جاتے ہیں۔ کلامی کتابوں میں جہاں یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ فلاں حدیث خبر واحد ہے یا فلاں دلیل ظنی ہے اس لئے اعتقاد کے باب میں مقبول نہیں ہے، اس سے پہلی اصطلاح کے مطابق "عقائد" مراد ہوتے ہیں اور جہاں عقیدے سے متعلق فروعی نوعیت کے مسائل میں متکلمین کے اختلافات اور پھر ان کے اجتہادی نوعیت کے دلائل ذکر کئے جاتے ہیں، وہاں اس دوسری اصطلاح میں عقیدہ مراد ہوتا ہے۔[1]

---

[1] اس سے علامہ البانی صاحب مرحوم وغیرہ سلفی مزاج حضرت کی وہ غلط فہمی بھی ختم ہو جاتی ہے جس کا وہ متکلمین کو الزام دیتے ہیں کہ اعتقادیات میں خبر واحد کو مسترد کرتے ہیں حالانکہ وہ شرعی حجت ہے اور سلف کے ہاں خبر واحد اور مشہور کا اس سلسلہ میں کوئی فرق نہ تھا۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ متکلمین اس کو مسترد نہیں کرتے بلکہ اپنے واقعی مقتضی کے مطابق اس پر عمل کرتے ہیں

دو قابل لحاظ باتیں

کسی چیز کو عقیدہ کا درجہ دینے اور پھر اس پر عقیدے کے مطابق تعامل کرنے میں اس پہلو کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ:

۱: کیا وہ چیز واقعۃً عقیدہ کا درجہ رکھتا ہے یا نہیں؟

۲: اگر جواب اثبات میں ہے تو کس نوعیت کا عقیدہ ہے؟ قطعی نوعیت کا ہے یا ظنی نوعیت کا؟

عصری کوتاہی

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہاں اس باب میں بھی کوتاہی کی جاتی ہے اور کوتاہی بھی دونوں جانب ہوتی ہے، چنانچہ جس طرح بعض لوگ عقیدہ کو اپنی واقعی حیثیت دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے بلکہ کسی بھی عقیدے میں وہ اختلاف کی گنجائش کا پہلو نکالنے پر مصر ہوتے ہیں، جب کہ اس کے برعکس بعض لوگ "عقیدے" کے نام وعنوان سے بیان کئے جانے والے ہر چیز کو ہر لحاظ سے قطعی قرار دیتے ہیں اوراس میں کسی بھی طرح اختلاف کی گنجائش دینے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے۔

، چنانچہ جب خبر واحد ظنی ہے، تو اس سے ظنی حد تک اعتقاد ثابت کرتے ہیں، تاہم چونکہ کلامی اصطلاح میں عقیدہ اور اعتقاد کا لفظ قطعیات کے ساتھ خاص ہوتا ہے، اس لئے یوں تعبیر اختیار کی جاتی ہے کہ عقائد کے باب میں خبر واحد مقبول نہیں۔ اس کو دوسرے الفاظ میں یوں تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ ظنی دلیل سے قطعی حکم ثابت نہیں ہوتا، اب اس میں آخر اشکال کی بات کیا ہے؟ اور کیا محض اس قدر بات کرنے سے کسی فرد نہیں بلکہ پوری جماعت کو اہل بدعت قرار دیا جاسکتا ہے!

مثال کے طور پر "حیات النبی ﷺ" کا مسئلہ ہے، اس میں اتنی بات تو منصوص ہے اور اس کا عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ حضرات انبیاء کرام (علیہم الصلوات والتسلیمات) اپنی قبور میں زندہ ہیں، لیکن اس کے بعد اس زندگی کی پوری نوعیت و کیفیت کیا ہے؟ یہ حیات تعلّقِ روح کے ساتھ ہے یا تلبّسِ روح کے ساتھ؟ یہ منصوص نہیں ہے، لہٰذا اس کو ضروری عقیدہ کا درجہ دینا اور اس کی بنیاد پر گمراہی کا فیصلہ کرنا بھی درست نہیں ہے، اس سلسلہ میں بعض اکابر اولیاء اللہ کے کچھ کشوف والہامات ہیں، ان کی بلاوجہ بے قدری اور توہین کرنا بھی درست نہیں ہے اور اس کو عقیدے کا درجہ دینا بھی درست نہیں ہے۔

مولانا محمد صدیق مراد آبادی رحمہ اللہ نے اس سے متعلق ایک عریضہ ارسال کیا تھا، جس کے جواب میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ خاص اس مسئلہ کے متعلق اپنے مخصوص تواضعانہ اسلوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"رہیں احادیث، ان کے رجوع کرنے کی اس وقت ضرورت نہیں، جو یہ تحقیق کیجئے کہ کون سی حدث صحیح ہے اور کون سی ضعیف؟ پھر مجھ کو ان باتوں کی خبر کم ہوتی ہے، کیونکہ یہ باتیں کتابوں سے متعلق ہیں اور آپ خود جانتے ہیں کہ جیسے سپاہی بے ہتھیار ہوتے ہیں، ایسا ہی یہ جاہل عالم بے کتاب ہے، یہ باتیں آپ خود حضرت شیخ کی تصانیف سے نکال لیں۔ مگر ایسا یاد پڑتا ہے کہ اکثر احادیثِ بابِ حیات ضعیف ہیں۔ زیادہ کیا عرض کروں! ہاں اتنا عرض کئے دیتا ہوں کہ گو عقیدہ تو یہی ہے اور میں جانتا ہوں ان شاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی رہے گا مگر اس عقیدہ کو عقائد ضروریہ میں سے نہیں سمجھتا، نہ تعلیم ایسی باتوں کی کرتا ہوں، نہ منکروں سے دست گریبان ہوتا ہوں، خود کسی سے کہتا نہیں پھرتا،

پھر کوئی پوچھتا ہے اور اندیشہ فساد نہیں ہوتا تو اظہار میں دریغ بھی نہیں کرتا۔ آپ اس امر کو ملحوظ رکھیں تو بہتر ہے۔ فقط"۔[1]

اس اقتباس کو نقل کرنے سے "مسئلہ حیات النبی ﷺ" کا تصفیہ کرنا مقصود ہے اور نہ ہی متعلقہ روایات پر محدثانہ کلام کا فیصلہ کرنا مطلوب ہے[2]، مقصود یہ ہے کہ عقائد کے باب میں فرقِ مراتب کرنا ضروری ہے اور تمام تر عقائد کے ساتھ یکساں سلوک کرنا کسی طرح درست نہیں ہوتا۔

تیسری غلطی: کتابی عقائد ہی کو اہمیت دینا

عقائد کے باب میں جس طرح افراط کی صورت میں متعدد غلطیاں کی جاتی ہیں، یوں ہی تفریط کی شکل میں بھی متعدد غلطیوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔

تفریط کی صورت میں جو متعدد غلطیاں انجام دی جاتی ہیں، ان میں ایک سرِ فہرست غلطی یہ ہے کہ صرف "کتابی عقائد" ہی پر اکتفاء کیا جاتا ہے اور انہی کو اہمیت دی جاتی ہے، "کتابی عقائد" سے وہ عقائد مراد ہے جن کا عقائد وکلام کی کتابوں میں ذکر کیا جاتا ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ ان کتابوں میں تمام اسلامی / شرعی عقائد کو ذکر نہیں کیا جاتا، بلکہ ان میں سے صرف ایک حصہ ہی ذکر کیا جاتا ہے، بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ زمانہ تدوین وتالیف میں انہی مندرجہ عقائد کے متعلق امت میں گمراہی کا سلسلہ جاری تھا، شاید یہی وجہ ہے کہ علم کلام کی مختلف کتابوں کا اگر

---

[1] لطائف قاسمیہ، ص۵

[2] اس کے لئے حضرت مولانا سرفراز خان صفدر صاحب رحمہ اللہ کی کتاب "تسکین الصدور" کی طرف مراجعت کی جاسکتی ہے۔

مقارناتی تجزیہ کیا جائے تو مختلف دور، علاقہ، ماحول اور شخصیات کے لحاظ سے مختلف کتابوں میں ذکر کردہ مسائل وعقائد میں فرق وتفاوت واضح ہوتا ہے، بعض عقائد ایک دور /علاقے /ماحول کی کتابوں میں ذکر ہوتے ہیں اور دوسرے دور /علاقے /ماحول کی کتابوں میں ان کا ذکر نہیں ہوتا۔

بہر حال، بتانے کا مقصود یہ تھا کہ علمِ کلام یا عقیدے کے عنوان سے جو کتابیں عام طور پر دستیاب ہوتی ہیں، ان میں تمام شرعی عقائد کا استقصاء نہیں ہوتا، بلکہ عموماً ان میں بقدرِ ضرورت ضروری عقائد ہی ذکر کئے جاتے ہیں، مثال کے طور پر "شرح عقیدہ نسفیہ"، "شرح مقاصد" اور "شرح مواقف" جیسی کتابوں کے مبحث "سمعیات" میں جو عقائد ذکر ہوتے ہیں، اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو پچاس، ساٹھ کے لگ بھگ عقائد ہی کا ذکر ہے، حالانکہ اسلامی عقائد صرف انہی میں منحصر نہیں ہیں۔

کلامی کتابوں کا مقام اور پس منظر

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ "کلامی ذخیرہ کتب" ناقص یا بے قیمت ہے، ایسا ہرگز مقصود نہیں ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ ہر کلامی کتاب سے اپنے دور میں رائج غلطیوں اور گمراہیوں کا انسداد مقصود ہوتا ہے، لہٰذا جس دور میں جو گمراہی پھیل رہی ہو، اس زمانے کی کلامی کتابوں میں عام طور پر اسی گمراہی اور اس کے غلط ہونے کا ذکر ملتا ہے، مستقبل میں آنے والی گمراہیاں چونکہ پیش نظر نہیں ہوتیں، اس لئے ان کا ذکر بھی نہیں کیا جاتا، البتہ اجمالی ایمان کے درجے میں یہی سبق دیا جاتا ہے کہ قرآن وسنت کی تمام تر تعلیمات برحق ہیں، ان پر ہمارا ایمان ہے۔ ظاہر ہے کہ بے

چارے انسان کی یہی استطاعت ہے اور ہر شخص اپنے استطاعت ہی کی حد تک مکلف ہے، لہٰذ متکلمین حضرات کی یہ خدمات بے قیمت یا کم قیمت ہر گز نہیں ہے، تاہم ہمارے اس پُر فتن دور میں جب نت نئی گمراہیاں وجود میں آگئیں اور ہزاروں لوگ اس کے شکار ہونے لگے، اس وقت ان گمراہیوں کی تردید کرنا اور اس موضوع سے متعلق جن باتوں کا عقیدہ کے طور پر تصدیق کرنا ضروری ہے، ان کا ذکر کرنا اور ضرورت و مصلحت کی رعایت کے ساتھ اس کی ترویج کرنا لازم ہے۔

مثال کے طور پر آسمان کا وجود، جنات کا وجود، انسان کا عبدیت ہی کے لئے پیدا ہونا، دین اسلام کا تمام شعبہائے زندگی پر محیط ہونا، اسلام کے بر خلاف کسی بھی نظام کا اسلامی تعلیمات و نظام سے کم تر ہونا، اسلامی تعلیمات ہی کا معیار خیر و شر ہونا، کفر، شعائر کفر اور اہل کفر سے ذہنی بغض و بعد کا ضروری ہونا، وغیرہ، ایسی بیسیوں باتیں ہیں جو عام طور پر علم کلام کی قدیم کتابوں میں ذکر نہیں ہوتی، کیونکہ اس وقت ان باتوں کو ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، پوری امت ان کو ایک گونا بدیہی باتیں تصور کرتی تھی، لیکن اس وقت کے مخصوص حالات و عناصر کی وجہ سے اب مسلمان معاشرے کے بھی بہت سے افراد اس سے غافل بلکہ متجاوز ہیں، لہٰذا ان کو اجاگر کرنا ضروری ہے اور جس طرح ان کتابی عقائد میں سے کسی عقیدے کا انکار کرنا مذموم، بدعت یا کفر کا باعث بن سکتا ہے، اسی طرح ان باتوں میں سے بھی کسی بات کا انکار کرنا حسب دلیل بدعت یا کفر و فسق کا موجب ہو سکتا ہے۔

دردمندانہ گزارش

کافی تلاش کرنے کے باوجود اس ناکارہ کو ایسی کوئی کتاب نہیں مل سکی جس میں تمام دینی عقائد استیعاب واستقصاء کے ساتھ ذکر ہو، کاش کوئی ایسا شخص اس کی ٹھان لے جو قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ علم کلام اور علم اصول فقہ میں مہارت رکھتا ہو اور ساتھ بلند ہمتی اور جوان مردی سے بھی مالامال ہو! یہ اس دور کی بڑی دینی خدمت شمار ہوگی ان شاء اللہ۔

چوتھی غلطی: ہر کلامی کتاب سے عقیدہ لینا

حضرات محدثین کرام نے حدیث اور کتب حدیث کو مختلف طبقات میں تقسیم فرمایا ہے، تمام احادیث یا کتب حدیث کا حکم یکساں نہیں ہے، اسی طرح حضرات فقہائے کرام اور اصولیین نے فقہی مسائل اور فقہی کتب کو بھی مختلف طبقات میں تقسیم فرمایا ہے، تمام فقہی مسائل اور تمام فقہی کتب کا حکم برابر نہیں ہے، بلکہ ہر مسئلہ کا اپنا مقام ورتبہ ہے ،یوں ہی ہر کتاب کی اپنی حیثیت اور اپنا درجہ ہے۔ علم کلام کی کتابوں میں بھی ایسی درجہ بندی کرنا اس وقت بہت ضروری معلوم ہوتا ہے، جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس وقت علم کلام اور علم عقائد کے نام پر کتابوں کا وسیع ذخیرہ دستیاب ہے جن میں سے کچھ کتابیں ماضی بعید وقریب میں تالیف کئے گئے ہیں اور کچھ زمانہ حال کی تالیف شدہ ہیں، ان کتابوں میں بہت سے ایسے مسائل کو عقائد کے طور پر ذکر کیا جاتا ہے جن کی حیثیت "عقیدے" کی نہیں ہوتی یا عقیدہ کہنا تو درست ہوتا ہے، لیکن اس حد تک قطعی اور یقینی نہیں ہوتا جس کی بنیاد پر کسی کو کافر یا مبتدع قرار دیا جاسکے، لیکن اہل علم

کہلانے والے افراد میں سے بھی شاید اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو محض علم کلام یاعقائد کی کتاب میں درج ہونے کی وجہ سے کسی بھی مسئلہ کو ضروری عقیدہ کا مقام دیتے ہیں اوراس کی بنیاد پر بدعت، فسق، گمراہی یاکفر کے فیصلے کرتے ہیں۔

علم کلام کی کتابوں پر جن حضرات کو دسترس حاصل ہو،ان سے اس کی مثالیں مخفی نہیں ہیں، ایسی بیسیوں باتیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ قدیم کتابوں کو تو چھوڑئے ،خود "المہنّد"ہی کو لیاجائے ، اس کو "عقائد اہلِ سنت والجماعت ویوبند" کے نام سے نشر کیاجاتاہے اوراس کو اہل حق کا معیار ومیزان قرار دیاجاتاہے، لیکن اس میں بعض ایسی باتیں موجود ہیں جن کو اس طرح "معیارومیزان" قرار دیناکسی طرح درست نہیں ہے، مثال کے طور پر اس میں "شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی" کاحال و حکم مذکور ہے، وہ جواب بنیادی عقیدے کی حیثیت نہیں رکھتا،اور اگر کوئی شخص تاریخی بنیادوں پر اس سے اختلاف کرتاہے تو محض اس اختلاف کرنے کی وجہ سے اس کو اہل سنت والجماعت سے خارج قرار دیناکسی طرح معقول نہیں ہے۔

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ علم حدیث وفقہ کی طرح علم کلام کی کتابوں اور ان میں درج ہونے والے عقائد ومسائل کی بھی درجہ بندی کی جائے،اس میں خوب احتیاط وتثبّت سے کام لیاجائے تاکہ غلط فہمیوں اور غلط کاریوں کادروازہ ہی مسدود ہوجائے۔

اللہ تعالیٰ فہم سلیم اور صراط مستقیم پر استقامت نصیب فرمائیں۔

مفتی عبید الرحمان مردان